علم وعمل کا پیکر۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

* ڈاکٹر محمود احمد غازی

انتہائی قابل احترام جناب وائس چانسلر، پروفیسر ڈاکٹر سید الطاف حسین، برادران گرامی، خواہران محترم!
وقت تنگ ہے باتیں کہنے کے لیے بہت ہیں ڈاکٹر صاحب کی زندگی اتنی بھرپور، اتنی غیر معمولی خدمات اور Contribution سے اتنی بھرپور ہے۔ اتنی پُر ہے کہ اتنی مختصر گفتگو میں ان کی شخصیت کا احاطہ کرنا اور ان کے علمی کام کا جائزہ لینا مشکل ہی نہیں ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر ان سے ملنے کا ۱۹۷۳ء میں نیاز ہوا۔ اور ان سے دنیا سے تشریف لے جانے کے آخری مہینوں تک جاری رہا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کے قلم سے کوئی ایسی تحریر نہیں نکلی جو انہوں نے کبھی اپنے دستخط یا دستخط کے بغیر مجھے اس کے ارسال سے مشرف نہ فرمایا ہو، اس دوران میں بار بار ایسے مواقع آئے کہ ڈاکٹر صاحب نے بعض زیر تحقیق معاملے میں مجھے اس کا مستحق سمجھا، اس قابل گردانا کہ مشاورت کا شرف عطا کرسکیں۔ اگرچہ مجھے اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ انہوں نے مجھے کسی مسئلے میں مشاورت کا شرف عطا فرمایا تو میرے پاس اس مشاورت کا کوئی جواز نہیں تھا اور میں ان سوال کا جواب نہیں دے سکا یقیناً آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ انہیں کوئی ایسا مسئلہ پیدا ہوا اور اس کا جواب اپنے دستیاب مآخذ میں یا اپنے سمندر جیسے علم یا دماغ میں نہ ملا ہو تو اس کا جواب کون دے سکتا ہے اور کیسے دے سکتا ہے؟ کم از کم میرے جیسے انسان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ میں ان کے کسی سوال کا جواب دے سکوں۔

ڈاکٹر صاحب نے اسلامی علوم وفنون کے تقریباً ہر میدان میں قلم اٹھایا۔ کم وبیش ۱۱۵ ایسے موضوعات ہیں جس پر ڈاکٹر صاحب کی نہ صرف تحقیقات بلکہ رجحان ساز تحقیقات موجود ہیں۔ جس سے دنیا بھر کے اہل علم استفادہ کر رہے ہیں سیرت، تفسیر اور حدیث بین الاقوامی قانون کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے اسلامی معاشیات پر، مسلمانوں کی فلکیات پر حتی کہ مسلمانوں کی علم نباتات، علم لغت وتاریخ پر، مسلمانوں کی ماہی گیری پر، مسلمانوں کے فن زراعت پر،

* نائب صدر، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

مسلمانوں کی جہاز رانی پر اور ان جیسے بہت سے موضوعات ہیں۔ جن کو انہوں نے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور ان موضوع پر کتابیں لکھیں لیکن ان سارے موضوعات پر جب وہ تحقیق کی ذمہ داری انجام دے رہے ہوتے تھے تو ان کا مقصد صرف ایک ہوتا تھا کہ اپنے پڑھنے والوں کو بالعموم اور مسلمان قاری کو بالخصوص اس اعتماد سے روشناس کرائیں جو اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب وتمدن کے لیے ان کے دل کی گہرائیوں میں اور جذبات واحساسات میں اور رگ وپے میں موجود ہوتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب گیارہ زبانیں جانتے تھے۔ ان میں سے آٹھ زبانوں میں انہوں نے براہِ راست لکھا۔ ان کی کتابیں عربی، روسی، جرمنی، ترکی، اردو، انگریزی، فرانسیسی، فارسی میں موجود ہیں۔ روسی زبان انہوں نے ۱۹۵۳ء میں سیکھ لی تھی۔ جب وہ لینن گراڈ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لیے جانا چاہتے تھے۔ لیکن کسی وجہ سے نہیں جا سکے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کئی زبانیں جانتے تھے کہ جن سے استفادہ کرنا ان کے لیے آسان رہتا تھا۔ یہ زبانیں کس جذبے سے سیکھتے تھے اور ان کے دل میں کس طرح کے احساسات تھے۔ اس کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ جب ان کی عمر تقریباً ۸۸ سال ہوئی اور ان کو پتا چلا کہ تھائی زبان میں قرآن کریم کا کوئی مستند اور مکمل ترجمہ موجود نہیں۔ انہوں نے ایک دو حضرات سے تبادلہ خیال کیا اور معلوم ہوا کہ تھائی زبان جاننے والا کوئی ایسا صاحب علم فوری طور پر دستیاب نہیں کہ جس سے درخواست کی جائے کہ وہ تھائی زبان میں قرآن کا ترجمہ کر سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے ۸۸ سال کی عمر میں تھائی زبان سیکھنا شروع کی اور اس عزم وارادے سے سیکھی کہ جب اتنی زبان سیکھ لیں گے جو قرآن کریم کا ترجمہ کرنے کے لیے آسان ہو تو بعد میں جب اللہ نے مہلت دی تو وہ خود قرآن کریم کا ترجمہ کریں گے۔ ۱۹۴۹ء میں جب وہ پاکستان میں رہتے تھے تو ان کی ملاقات برصغیر کے نامور سیاسی قائد، عالم اور آزاد کشمیر کے سابق صدر میر واعظ مولانا محمد یوسفؒ سے ہوئی۔ انہوں نے میر واعظ مولانا یوسفؒ سے قرآن کے ترجمے کے بارے میں تبادلہ خیال کیا اور انہیں آمادہ کیا کہ وہ قرآن کریم کا کشمیری زبان میں ترجمہ کریں۔ میر واعظ مولانا یوسفؒ نے ڈاکٹر صاحب کے کہنے پر قرآن کریم کا ترجمہ کیا۔ اس کام میں انہوں نے ان کی مالی اعانت فرمائی لیکن اس اعانت کی کیا نوعیت تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کا اظہار نہیں کیا مجھے نہیں معلوم، لیکن میر واعظ نے کہیں لکھا ہو یا کسی سے کہا ہو تو میرے علم میں نہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے معاملے میں انتہائی اخفاء سے کام لیا کرتے تھے۔ وہ اپنی جانب سے

کیے گئے کسی Contribution کا اظہار پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن ایک خط میں انہوں نے مجھے لکھا کہ اس زمانے میں مجھے مرحوم میر واعظ کی مالی اعانت کی سعادت ہوئی۔ ایک جملہ انہوں نے اسی سیاق وسباق میں لکھا۔ جس سے پتہ چلا کہ قرآن پاک کی کشمیری زبان میں ترجمہ اور اشاعت کو کتنی اہمیت دے رہے تھے۔ ۱۹۸۳ء میں غالباً یا ۱۹۸۶ء میں غالباً انہوں نے جنرل ضیاء الحق مرحوم کو خط لکھا اور اس ترجمے کی اشاعت کی طرف توجہ دلائی۔ طویل عرصہ وہ اس طرح اس پروجیکٹ کو ساتھ لے کر چلے تھے، ایسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کا صف اول کا پروجیکٹ تھا اور سوائے چند لوگوں کے کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کشمیری زبان میں قرآن پاک کے ترجمے کو کتنی اہمیت دیتے اور دلچسپی رکھتے تھے۔

ایک زمانہ تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان ایک تھے پھر وہاں لسانیات کا مسئلہ کھڑا ہوا۔ لسانیات کا مسئلہ کس لیے کھڑا ہوا؟ اردو زبان بنگالیوں کے لیے قابل قبول تھی یا نہ تھی۔ ان سب چیزوں سے قطع نظر ان کے ذہن میں ایک تجویز آئی تو ڈاکٹر صاحب نے یہ تجویز دی اور سوچا کہ اگر بنگلہ زبان کو عربی رسم الخط میں لکھا جائے اور اُردو زبان کے لیے کوئی نسخ رسم الخط اختیار کر لیا جائے اور کوشش کی جائے کہ دونوں زبان کے اہل علم اور لکھنے والے عربی اور فارسی کے ان مشترک الفاظ کو جو دونوں زبانوں کے اہل علم جانتے ہیں۔ رواج دینے کی شعوری کوشش کریں تو ایک زمانہ آ سکتا ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان سے لسانی اختلاف کا مسئلہ ختم ہو جائے آپ دیکھیں ایک شخص جو پیرس کے ایک گوشے میں پانچویں منزل میں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں بیٹھا ہوا ہے۔ بظاہر اس کا پاکستان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ ریاست حیدر آباد کا شہری ہے اور لیسے پاسے کے نام سے ایک Travel Document پر دُنیا میں سفر کرتا ہے۔ پیرس میں پناہ گزین ہے اور پیرس کے ایک تعلیمی اور تحقیقی ادارے سے وابستہ ہے۔ لیکن دنیائے اسلام میں جتنی کاوشیں اور کوششیں ہو رہی ہیں وہ ان سے واقفیت رکھتا ہے۔

۱۹۸۰ء میں مجھے الجزائر جانے کا اتفاق ہوا، واپسی پر میرا ارادہ پیرس سے ہو کر آنے کا تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دی کہ الجزائر سے دعوت نامہ آیا ہے اور میں فلاں پروگرام میں جا رہا ہوں اور واپسی میں پیرس کے قیام کا ارادہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اور بہت سی چیزیں جواب میں لکھیں اور یہ بھی لکھا کہ جہاں تک ممکن ہو الجزائر کے ذمہ داروں کو ادب اور احترام سے یہ توجہ دلائیے۔ یہ لفظ تھا ''ادب اور احترام سے توجہ دلائیے'' کہ مصر میں جامع الازہر موجود ہے۔ تونس میں جامعہ زیتونہ موجود ہے۔ مراکش میں جامع قروین موجود ہے کیا اچھا ہو کہ ایسی ایک اعلیٰ

یونیورسٹی الجزائر میں بھی ہو۔ گویا کہ ان کے ذہن میں تھا کہ الجزائر ایک اتنا بڑا ملک ہے۔ وہاں کوئی بڑا تعلیمی ادارہ اس سطح کا نہیں ہے جس کو اس معیار پر رکھا جا سکے تو ظاہر ہے ان کے ذہن میں کوئی ایسی چیز طاری ہوگی جب میں نے خط لکھا تو انہوں نے فوراً توجہ دلوائی اس طرح سے دنیائے اسلام سے مختلف معاملات سے ان کی دلچسپی اس طرح رہتی تھی مگر لگتا تھا کہ وہ ہر وقت اسی پر غور کرتے رہتے ہیں کہ دنیائے اسلام کو کیا مسائل درپیش ہیں۔ ایک مرتبہ ایک مسلم برادر ملک کے وزیر خارجہ پیرس گئے اتفاق سے مجھے بھی انہی دنوں پیرس جانے کا اتفاق ہوا اور چند روز کے لیے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ایک دو روز رہی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے لکھا کہ فلاں ملک کے سفارت خانے کو خط لکھا۔ اخبار میں تصویر چھپی تھی کہ فلاں ملک کے وزیر خارجہ نے اپنے ہم منصب کو لنچ کی دعوت دی اور اخبارات میں یہ بھی لکھا۔ شرارت سے لکھا یا ویسے ہی لکھا کہ یاد رہے کہ یہ رمضان کا مہینہ ہے اور رمضان میں مسلمان روزہ رکھتے ہیں۔ لیکن فلاں مسلم ملک کے وزیر خارجہ نے فلاں ملک کے وزیر خارجہ کو لنچ کی دعوت دی تو ڈاکٹر صاحب نے کہا میں نے اس ملک کے وزیر خارجہ کو خط لکھ اور یہ لکھا کہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ محترم وزیر خارجہ، آپ سفر پر پہلے تشریف لائے تھے اور مسافر پر روزہ فرض نہیں ہے تو اس لیے شرعاً کوئی قباعت نہیں معلوم ہوتی کہ وہ اپنے ہم منصب کو لنچ کی دعوت دے لیکن اس لنچ میں یقیناً وہ لوگ بھی شامل ہوئے ہوں گے جو سفارت خانے میں ہیں اور پیرس میں مقیم رہتے ہیں۔ انہوں نے اس رعایت کا فائدہ اٹھایا ہے۔ بہتر ہوتا کہ یہ لنچ کی بجائے ڈنر ہوتا اور دعوت افطار کے بعد دی جاتی۔ یہ خط لکھ کر ان کو بھیج دیا۔

جس دن ان سے میری ملاقات ہوئی اس دن اس سفارت خانے سے سفیر کا جواب آیا تھا۔ سفیر کے حکم سے کسی اور اہلکار کا جواب تھا۔ اس میں لکھا ہوا تھا کہ آپ شاید بھول گئے کہ ہمارا ملک ایک سیکولر ملک ہے اور ہم کسی مذہب پر یقین نہیں کرتے۔ اس لیے آپ کا اعتراض ہم پر وارد نہیں ہوتا اس پر وہ بڑے دکھ اور افسوس کا اظہار کر رہے تھے اور پھر میں نے یہ سوال پوچھا کہ اس طرح کے ممالک کو دارالسلام کی تاریخ میں رکھا جائے یا پھر دارالحرب کی تاریخ میں رکھا جائے کہ یہ نہ تو دارالحرب ہے اور نہ ہی اس کو دارالسلام کہا جا سکتا ہے۔ اس پر وہ کافی دیر تک وہ اپنا تبادلہ خیال اور اظہار خیال فرماتے رہے۔ یہ باتیں ایسی ہیں کہ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دنیائے اسلام کی تازہ ترین صورت حال سے اور مسلمانوں کو Latest معاملات سے ان کو کس حد تک دلچسپی تھی کہ کس طرح وہ ان معاملات

پر غور و خوض کیا کرتے تھے۔ عملی اعتبار سے جس کا میں نے عرض کیا کہ انہوں نے اسلامی علوم وفنون کے تقریباً ہر میدان میں کام کیا ہے اور کوئی اہم میدان ایسا نہیں کہ جس میں ان کی عمیق اور بالغ نظر تحقیقات موجود نہ ہو۔ لیکن خاص طور پر جو موضوعات ان کی خصوصی دلچسپی کے ہیں وہ چار ہیں۔ ایک علم الحدیث جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا اور دوسرا سیرت ہیں۔ جس پر کم وبیش انہوں نے ۶۵ سال تک کام کیا اور اتنی وقیع کتابیں چھوڑ کر گئے کہ ان کو اس کی بنیاد پر سیرت کا مجدد اس دور میں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا اس لیے کہ علم سیرت کی انہوں نے نئی نئی جہتیں تلاش کی ہیں اور نئے نئے سوالات اکٹھا کر کے محققین کے لیے نئے نئے راستے کھولے ہیں کہ ماضی کے محققین سیرت میں سے صدر اسلام کے چند ایک محققین کو ان کے ساتھ اس مقابلے پر رکھا جا سکتا ہے اس کے بعد پورے ایک ہزار سال کے دور میں جتنے سیرت کے محققین ہیں ان کا درجہ ان سب سے آگے یا کم از کم نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ علم حدیث میں ان کا کارنامہ اتنا تاریخ ساز کارنامہ ہے کہ اس نے مستشرقین کے اعتراضات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر کے رکھ دیا اور اب پچھلے ۴۰ اور ۵۰ سال میں کسی ذمہ دار اور سمجھ دار سنجیدہ انسان نے وہ اعتراضات نہیں اٹھائے۔ ایک زمانہ تھا کہ کہا جاتا تھا کہ حدیث کی جو مشہور کتابیں ہیں یہ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی ہیں اور یہ گویا سنی سنائی یادداشتوں پر یا باتوں یا Hear Say Evidence کی بنیاد پر یہ کہی سنی باتیں جمع کر دی گئی ہیں اور ان کی کوئی تاریخی یا علمی بنیاد نہیں ہے اور گولڈز ہیر نے، اس کے تلامذہ میں ''شاخت'' نے اور ''شاخت'' کے اثر میں ''محمود ابوریہ'' ہوا کرتے تھے مصر میں تھے ہمارے ہاں ''غلام احمد پرویز'' نے اور اس طرح بہت سے اہل علم نے ان چیزوں کو دہرایا اور یہ بات گویا تسلیم کروانے کی کوشش کی گئی کہ علم حدیث کی بنیاد کسی ٹھوس تاریخی وثائق پر نہیں ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ پہلے انسان ہیں جنہوں نے اس موضوع کو اپنی تحقیق کا میدان بنایا اور آج سے تقریباً ۷۰ سال پہلے ۱۹۴۰ء میں انہوں نے اس موضوع پر کتاب لکھی اور ایک قدیم حدیث کی کتاب اور صحیفہ جو حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگرد رشید ہمام ابن منبہ کا تیار کیا ہوا تھا اور براہِ راست ایک صحابی کی نگرانی میں وہ مجموعہ تیار ہوا تھا اور انہوں نے تحقیق کی اور ایڈٹ کیا اور اس پر انہوں نے بڑا تفصیلی مقدمہ لکھا اور مقدمہ میں انہوں نے ایک چیز کو بطور مثال لے کر یہ بتایا کہ جتنے بھی محدثین کے مجموعے تھے ان کی ماخذ تحریری بھی تھے اور زبانی بھی تھے اور قدیم مآخذ کو ایک ایک کر کے جائزہ لیا اور بتایا کہ مثلاً امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ابوداؤدؒ، امام ترمذیؒ کے مآخذ ہیں وہ مآخذ اسی طرح کے ہیں

کہ جس طرح کسی بھی ایک مستند، تاریخی اور علمی دستاویز کے ماخذ ہو سکتے ہیں اس کے بعد کسی مستشرق نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ علم حدیث کے مآخذ اساسی کسی سنی سنائی باتوں پر ہیں اور اس کی بنیاد کسی تحریری اور تاریخی طور پر قابل قبول دستاویز پر نہیں ہے۔ لیکن اس کے بعد ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنے علمی کیریئر کا آغاز ایک قانون کے استاد کے طور پر کیا تھا۔ انہوں نے ابتدائی کتابیں جو ۱۹۳۰ء یا ۱۹۴۰ء کی دہائی میں لکھیں، ان میں اکثر و بیشتر قانون، اصولِ قانون اور خاص طور پر بین الاقوامی اسلامی قانون پر ہیں۔ وہ جامعہ عثمانیہ میں، بین الاقوامی اسلامی قانون کے استاد اور پروفیسر تھے۔ اور اسی حیثیت سے وہ بین الاقوامی وفد کے بھی رکن تھے۔ جو حیدر آباد (دکن) کے وزیر اعظم میر لائق کی قیادت میں اقوامِ متحدہ سیکورٹی کونسل میں جا رہا تھا۔ اپنے ملک کا مقدمہ پیش کرنے کے لیے اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ بطور بین الاقوامی قانون کے ماہر کے اس وفد میں شامل تھے۔

لیکن بین الاقوامی اسلامی قانون پر کام کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو یہ خیال ہوا کہ بین الاقوامی قانون کے میدان میں سب سے نمایاں کارنامہ قدیم اقوام میں مسلمان ماہرین قانون کا ہے اس نے ان کو مسلم بین الاقوامی قانون کی طرف متوجہ کیا تو امام محمدؒ اور اُن کی کتب پر انہوں نے کام کیا۔ ابو حنیفہؒ اور جو اس دور کے دوسرے فقہاء تھے ان کی تحریروں کو دیکھا تو ان کی دلچسپی بین الاقوامی قانون کے اس پہلو میں پیدا ہو گئی۔ پھر ان کی دلچسپی اس طرف ہو گئی جو مسلمانوں کی Contribution ہے اس طرح انہوں نے مسلمانوں کے بین الاقوامی قانون پر کم و بیش نصف درجن کتابیں لکھیں ان کی پی ایچ ڈی کے تینوں مقالے بین الاقوامی اسلامی قانون سے متعلق ہیں۔

- ایک مقالہ انہوں نے جرمنی کی بون یونیورسٹی میں پیش کیا جس کا عنوان تھا کہ:

  ''اسلامی بین الاقوامی قانون میں غیر جانبدارمی کا تصور''

- اسی طرح انہوں نے سوربورن میں جو مقالہ فرانسیسی میں پیش کیا۔ اس کا عنوان تھا کہ:

  ''رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور میں اسلامی سفارتکاری اور اس کے آداب و قواعد''

  یہ مقالہ ان کا دو جلدوں میں تھا یہ دونوں جلدیں مطبوعہ ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء میں پیرس میں چھپی تھیں اور ڈاکٹر صاحب نے مجھے اس کی فوٹو کاپی عطا فرمائی تھی۔

- تیسرا مقالہ جوانہوں نے جامعہ عثمانیہ میں پیش کیا تھا جواب تک کی، اُن کی تحریروں میں اس موضوع میں بہترین تحریر کی حیثیت رکھتا ہے "Muslim Conduct of State" ہے جو انگریزی میں تیار کیا گیا تھا اور یہ بیسویں صدی میں اسلام کے بین الاقوامی قانون پر لکھی جان والی ابتدائی اور بہترین کتابوں میں سے ایک کتاب ہے جس میں انہوں نے اسلام کے بین الاقوامی قانون کو دور جدید کے بین الاقوامی قانون کے اسلوب اور سٹائل پر مرتب و مدون کیا اور وہ تمام موضوعات اور مسائل جو دورِ جدید کے بین الاقوامی قانون میں اٹھائے گئے ان سب مسائل کا انہوں نے اسلامی ماخذ سے حل تلاش کیا اس مواد کو یکجا کیا اور ایک نئی ترتیب سے جو پہلے انداز کی اور منفرد ترتیب تھی دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کے اس اسلوب کی پیروی کرتے ہوئے عرب وعجم میں درجنوں مصنفین نے اسلام کے بین الاقوامی قوانین پر کتابیں لکھیں۔ لیکن اس میں اولیت کا شرف صرف ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کو حاصل ہوا۔ بین الاقوامی قانون پر جب وہ مآخذ ومصادر کا مطالعہ کر رہے تھے اور اس کا جائزہ لے رہے تھے تو انہیں سیرت کی کتابوں سے واسطہ پڑا، اور اس واسطے سے ان کی دلچسپی سیرت میں پیدا ہوگئی۔

اس کے بعد ۱۹۴۰ء۔۱۹۴۵ء کے سالوں کے بعد سے لے کر زندگی کے آخری سالوں (۱۹۹۷ء۔۱۹۹۶ء) تک جب تک وہ کام کرتے رہے ان کی دلچسپی کا موضوع صرف سیرت یا وہ موضوعات رہے جو براہِ راست یا بالواسطہ سیرت سے متعلق ہوں۔ اگرچہ جزوی طور پر وہ ان تمام موضوعات پر کام کرتے رہے جن کا میں نے ذکر کیا لیکن ان کی حیثیت جزوی تھی ان کی دلچسپی کا اصل عنوان سیرت اور سیرت سے متعلقہ امور تھے لیکن انہوں نے اپنے ابتدائی مضمون کو چھوڑا نہیں۔ بین الاقوامی قانون پر ان کی چیزیں مسلسل آتی رہیں اور تحقیق کے نئے نئے گوشے وہ دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے۔ وہ شاید پہلے آدمی ہیں اس دور میں جنہوں نے عہد نبوی کے سیاسی وثائق کو جمع کیا اور اس زمانے کے لحاظ سے جتنے دستیاب ماخذ تھے ان سب کا جائزہ لے کر عہدِ نبویؐ اور خلفائے راشدین کے دور کے ۴۰۰ سیاسی وثائق انہوں نے جمع کیے جس سے بڑا مجموعہ اس وقت عربی یا اور کسی زبان میں موجود نہیں ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر صاحب کی وہ فرانسیسی زبان میں سیرت کی کتاب جو دو جلدوں میں ہے اور اس میں ڈاکٹر صاحب کی تازہ ترین تحقیقات شامل ہیں، جس کا آخری ایڈیشن ڈاکٹر صاحب نے مجھے عطا فرمایا۔ وہ ۱۹۹۰ء یا ۱۹۹۱ء کا ہے۔

۱۹۹۰ء۔۱۹۹۱ء تک کی پوری تحقیقات اس میں شامل ہیں جب ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا کہ میں نے اس کتاب کے ترجمے کا بیڑا اٹھایا ہے تو ڈاکٹر صاحب نے غالباً ۱۹۹۵ء۔۱۹۹۴ء میں اپنے ہاتھ کے ٹائپ شدہ کوئی پچاس صفحات کے قریب مواد بھیجا اور اس پر لکھا تھا کہ یہ وہ اصلاحیں اور ترمیمیں ہیں ڈاکٹر صاحب اُردو لکھتے ہوئے ''الف ت'' سے جمع نہیں کرتے۔ ہم لوگوں کی زبان پر اصلاحات اور ترمیمات چڑھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ ''ی ان'' یا ''ون'' سے جمع کیا کرتے تھے اس میں لکھا کہ، یہ وہ اصلاحیں یا ترمیمیں ہیں جو کتاب کے نویں ایڈیشن کے بعد مرتب کی گئی ہیں براہِ کرم اس کو ترجمے میں شامل کر لیا جائے۔

گویا ۱۹۹۴ء۔۱۹۹۳ء کے دوران بھی ان کو جو نیا مواد ہاتھ آتا گیا اس کو ایک الگ دستاویز کی شکل میں مرتب کرتے گئے۔ اور وہ دستاویز مسودات، اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں جو اس ترجمے میں اضافہ کیا جانا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس سے کوئی نئی بات معلوم ہوا اور وہ ڈاکٹر صاحب کے علم میں آئے اور اس کا نوٹس نہ لیں وہ اس کام کو کیسے کرتے تھے مجھے نہیں معلوم ہم سب میں سے اکثر کا تعلق لکھنے پڑھنے سے ہے بہت سی چیزیں ہمارے موضوع سے متعلق دیکھنے میں آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں پھر بعد میں ملتی بھی نہیں اور یاد ہی نہیں رہتا۔ ڈاکٹر صاحب ان میں سے ایک ایک چیز کا پوری طرح سے تعاقب بھی کرتے اور اس کو محفوظ بھی رکھا کرتے تھے۔ میرے پاس (اور اُن کے بہت سے دیگر نیاز مندوں کے پاس) خطوط ہیں۔ ان خطوط میں بعض کا انداز ایسا ہوتا ہے اور لکھتے تھے کہ:

> ''میں نے یہ سنا ہے کہ جنگ اخبار میں ایک مضمون چھپا ہے اس میں قرآن پاک کا مثلاً براہوی ترجمے پر کوئی بات کی گئی ہے کیا اس میں کوئی نئی بات ہے؟ اگر نئی بات ہو تو براہِ کرم اس کی عکسی نقل مجھے بھیج دیں۔ اخراجات فوراً روانہ کر دونگا۔ یہ جملہ ضرور ہوتا تھا ان سے کوئی پوچھے بھی آپ کو پورا جنگ اخبار ہی بھیج دیں گے۔ اس کی فوٹو سٹیٹ کی کیا ضرورت پیش آئے گی۔ لیکن یہ جملہ ان کا ضرور ہوتا تھا کہ کوئی اخراجات ہوں تو مجھے بتایا جائے میں اس کو پیش کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

لیکن اگر جواب میں ان سے کوئی نقل منگوائی جائے جیسا کہ ایک دو دفعہ اتفاق ہوا کہ میں نے ان سے گزارش کی کہ

پیرس کی فلاں لائبریری میں فلاں کتاب کی نقل بھیج دیں تو انہوں نے صرف وہ کتاب بھیج دی بلکہ اس بات کا برا منایا کہ میں نے ان سے اخراجات کا سوال کیوں کیا؟

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میں نے اپنے دوست سے جو فرانس میں پاکستانی سفارت خانے میں کام کرتے تھے ان کو لکھا کہ اتنی رقم ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیں تو ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف رقم واپس کر دی اور مجھے شکایت کا خط لکھا اور منع کیا کہ اس طرح کی کوئی بات دوبارہ نہ لکھی جائے اور بلا تکلف جب کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے لکھا جائے میں ان شاء اللہ تعالیٰ بلا تکلف ہر قسم کی خدمت کے لیے حاضر ہوں یہ جملہ تقریباً ہر خط میں ہوتا تھا کہ ''خدمت کے لیے حاضر ہوں''۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے اتنے متنوع پہلو ہیں۔ علمی اعتبار سے بھی، انسانی اعتبار سے بھی، جن کو بیان کرنے کے لیے ایک طویل عمر اور ایک طویل وقت کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس وقت میرے پاس ۱۲۴ خطوط محفوظ اور دستیاب ہیں ممکن ہے کہ کچھ اور خطوط بھی کاغذات سے مل جائیں۔ ان خطوط کو مرتب کرنے کا پروگرام ہے اور ان خطوط کی تمہید میں یہ ساری یادداشتیں جو ابھی تک حافظے میں ہیں لکھی نہیں گئیں اس تمہید میں لکھنے کا پروگرام ہے۔ بظاہر تمہید بھی ۱۵۰۔۲۰۰ صفحے کی ہوگی اس تمہید میں یہ سارے تاثرات اور واقعات جو میں نے دیکھے اس میں آئیں گے ڈاکٹر صاحب کو مجھ پر بڑا اعتماد پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہ بعض اوقات ایسی باتیں بھی بیان کر دیا کرتے تھے جو عام لوگوں سے بیان نہیں کرتے تھے۔ ایک واقعہ میں بیان کر دیتا ہوں جو مجھے یاد ہے اس سے پہلے بھی ایک دو دفعہ ذہن میں آیا مگر مجھے سنانا یاد نہیں رہا۔

> ''ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ جب وہ اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ پیرس میں لکھ رہے تھے تو کچھ مواد کے حصول اور حوالہ دوبارہ چیک کرنے کے لیے فاس جانے کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ وہ ٹرین سے پیرس سے فاس روانہ ہوئے اور فاس کی بندرگاہ پہنچے اور اس بندرگاہ سے ایک بحری جہاز سے سفر کر کے تونس آئے اور تونس سے کسی ٹرانسپورٹ سے سفر کر کے فارس پہنچے۔ فاس کے کتب خانے میں کام کرتے رہے۔ انہوں نے جتنا اندازہ کیا تھا کہ اتنے پیسے خرچ ہو نگے اور ان کو اس زمانے میں ۷۵ روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ ریاست حیدرآباد کی جامعہ عثمانیہ سے اس کام کے لیے اب ۷۵ روپے ماہوار میں سے کتنی بچت ہوگی کہ پیرس سے وہ

فاس گئے اور وہاں کتنے اخراجات ہونگے اس کے لیے انہوں نے حساب کیا کہ اتنا آمدو رفت میں لگے گا اور اتنے اخراجات وہاں قیام کے ہوں گے اور اس طرح سے طے کر لیا جب وہاں کام شروع کیا تو معلوم ہوا کہ جتنی مدت کے لیے وہ سوچ کر آئے تھے اس سے زیادہ مدت کا کام ہے انہوں نے یہ طے کیا کہ باقی اخراجات میں تو کمی نہیں ہوسکتی اس لیے کہ بحری جہاز کا اور فارس سے تونس کی بندرگاہ کا وہاں پہنچنے تک کے اخراجات تو دینے ہیں جو وہاں قیام اور طعام کے اخراجات تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس میں، میں نے یہ طے کیا کہ پہلے ایک دن میں ایک وقت کھانا کھاؤں گا جب اخراجات میں کمی ہوئی تو کہا کہ دو دن میں ایک وقت کھانا کھاؤں گا جب پھر بھی کمی محسوس ہوئی تو طے کیا گیا کہ ۳ دن میں ایک وقت کھانا کھاؤں گا اور کام کرتے رہے۔ آخری دن جب وہ تین دن والا بھی ختم ہو گیا اور کام باقی رہا تو یہ طے ہو گیا کہ جب تک جان میں جان باقی ہے کام کرنا چاہیے اور جب جان نہیں ہوگی تو پھر بس کا ٹکٹ لے کر روانہ ہو جائیں گے۔ تو انہوں نے کہا کہ میں آخری دن بیٹھا ہوا تھا اور یہ خیال تھا کہ آج کے بعد مزید ٹھہرنا ممکن نہ ہوگا اور ۲، ۳ دن کا فاقہ ان کو ہو گیا تھا۔ لیکن کام باقی تھا۔ تو ظہر کی نماز جب پڑھی تو اللہ تعالیٰ سے دُعا کی اور اس میں رقت بھی طاری ہوئی کہ بڑا علمی کام ہے کتابیں، مخطوطات دستیاب ہیں پیسے ختم ہو گئے ہیں اللہ تعالیٰ کوئی غیب سے راستہ نکالیں۔ کہنے لگے کہ نماز پڑھ کر اپنے کتب خانے میں، جس گوشے میں جگہ بنائی ہوئی تھی وہاں آئے تو وہاں ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے جو لباس اور حلیے سے کوئی مرفہ الحال معلوم ہوتے تھے کہنے لگے آپ کا نام حمید اللہ ہے کہنے لگے کہ ہاں حمید اللہ ہے۔ پوچھا کہ آپ ہندوستان سے آئے ہیں کہنے لگے ہاں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ انگریزی جانتے ہیں، کہنے لگے کہ ہاں انگریزی جانتا ہوں، یہ گفتگو فرنچ میں ہو رہی تھی کہنے لگا کہ میں ایک تاجر ہوں اور فلاں ملک میں کام کرتا ہوں مجھے ہندوستان سے بعض تجارتی معاملات کے لیے کچھ خط و کتابت کرنی ہے کچھ خطوط میں نے تیار کیے ہیں اگر آپ ان خطوط کو انگلش

میں تحریر کر دیں تو جو معاوضہ آپ کہیں گے میں آپ کو دوں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا لائیے انہوں نے اسی وقت وہ خطوط بیٹھ کر ترجمہ کیے اور اس سے کہا کہ جو آپ دینا چاہیں وہ دے دیں، اس نے بہت اصرار کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ جو رقم اس نے مجھے دی وہ اس رقم سے چار پانچ گنا زیادہ تھی جو وہ پیرس سے لے کر چلے تھے اور اس رقم سے پورا سفر ہوا تھا اس کے بعد مزید وہاں قیام کیا اور جتنے کتب خانے دیکھنے تھے وہ دیکھے۔''

اس طرح انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ غیب سے ایسی مدد فرماتا تھا اور اس طرح کے بہت سے واقعات میرے علم میں ہیں جس میں انہوں نے کہا کہ محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا اور اس کا کوئی اور سبب اور وجہ معلوم نہیں ہے۔ اس طرح کے مسائل کے ساتھ زندگی گزار دی اس کے ساتھ ساتھ ان میں جود وسخا کا غیر معمولی جذبہ اور داعیہ پایا جاتا تھا اس کی مثالیں ان کا ہر نیاز مند جانتا ہے جو لوگ ان سے واقف رہے ان کو اس طرح کے بے شمار واقعات معلوم ہیں ان میں سے بعض میرے علم میں بھی ہیں جس کو ان شاء اللہ تعالیٰ اگر مجھے موقع ملا تو وہ خطوط کی تمہید میں لکھنے کا پروگرام ہے میں شکر گزار ہوں کہ مجھے گفتگو میں شرکت کی دعوت دی گئی اور ایک ایسے اجتماع میں شرکت کا موقع ملا جو میرے لیے روحانی اعتبار لذیذ بھی ہے اور علمی اعتبار سے بہت مفید بھی ہے اور ایک اعتبار سے دینی اور اخلاقی ذمہ داری بھی رکھتا ہے کہ ہم پاکستان کے اور برصغیر پاک و ہند کے ایک ایسے فرزند کو یاد کر رہے ہیں جس کی علمی مقام اور عظمت کا اعتراف سب لوگوں نے کیا۔

ہم علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں بیٹھے ہوئے ہیں ایک مرتبہ ہم نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اسلامیات، دینیات کے مختلف موضوعات پر کام کیا ہوا ہے۔ آپ کی کبھی علامہ اقبال سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ میری دو مرتبہ علامہ اقبال سے ملاقات ہوئی۔ ایک مرتبہ جب وہ خطبات مدراس کے لیے مدراس تشریف لے گئے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں اور چند نوجوان سفر کر کے حیدر آباد سے مدراس گئے تھے علامہ اقبال کے ایک یا دو خطبے ہم نے سنے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ میرا لاہور آنا ہوا تھا۔

(۱۹۳۲ء میں ''ادارۂ معارفِ اسلامیہ لاہور'' قائم ہوا تھا علامہ اقبال اس کے سربراہ تھے۔ اس کی دوسری سالانہ کانفرنس ۱۰، ۱۱، ۱۲/اپریل ۱۹۳۶ء میں لاہور میں ہوئی تھی اس میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھی شریک ہوئے تھے)

وہاں انہوں نے کہا کہ میں نے علامہ اقبالؒ کی زیارت کی تھی اور انہوں نے زیارت کے لفظ استعمال کیے۔ کہنے لگے کہ سو میں نے براہِ راست تو علامہ اقبالؒ پر نہیں لکھا۔ لیکن مجھے خیال ہوا کہ علامہ اقبال کے پیغام اور کلام سے اہل فرانس کو اور فرانکوفونز ین یعنی وہ دنیا جو فرانسیسی زبان بولتی ہے اس کو آشنا کرنا چاہیے تو میں نے اپنے شوق سے ان کے خطبات Reconstruction کا فرانسیسی ترجمہ کیا تھا اور اس کے بعد نظم کا کرنے کا پروگرام تھا تو جزوی طور پر ''جاوید نامہ'' کا ترجمہ کیا اور شائد کلی طور پر یا ''پیام مشرق'' کا ذکر کیا یا ''بالِ جبرئیل'' کا مجھے یاد نہیں رہا۔ ان دونوں میں سے ایک کا یا دونوں کا اور جزوی طور پر جاوید نامہ کا اور Reconstruction کا ترجمہ کیا لیکن انہوں نے کہا کہ ترجمہ کرنے کے بعد کوئی طابع یا ناشر نہ ملا تو میں نے ترجمہ ویسے ہی رکھ دیا ممکن ہے میرے کاغذات میں کہیں ہو۔

یہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی دلچسپی کے حوالے سے یہ ایک نئی معلومات ہیں جو لوگوں کے علم میں نہیں ہیں۔ میں شکر گزار ہوں آپ کا اور اللہ تعالیٰ سے دُعا گو ہوں کہ وہ ان کے نامکمل کاموں کی طباعت اور اشاعت کی کوئی صورت پیدا فرمائے۔ (آمین)